Comments تبصرے

ایک فریادی دستاویز

سعید سہروردی

جب آپ کی نظر سے کوئی ایسی کتاب گزرے جو الگ ہو، امتیازی ہو تو اس کے بارے میں لکھنا عصری فریضہ بن جاتا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کی تازہ ترین کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' اس معاملے میں منفرد ہے۔ یہ مشرقی ہند کے ایک بڑے مرکز میں اردو صحافت کی آزادی کے بعد کی جدوجہد کی سرگزشت ہے۔

یہ کتاب بہ یک وقت خودنوشت ہے، تاریخ ہے اور صحافت پر تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب کا عنوان مشہور ادیب اور نقّاد اور فروغ اردو کونسل کے وائس چیئرمین شمس الرحمٰن فاروقی نے طے کیا تھا۔ اگر کتاب ان کی ذات (مصنف) کے اردگرد گھومتی ہے تو رضوان اللہ صاحب کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ 'میں' تحریر کی دنیا میں ایک بہت بڑا اگڑھا ہے جس میں بڑے بڑے شہسوار گر جاتے ہیں، بہت کوشش کرتے ہیں، جب نکل نہیں پاتے ہیں تو اسی کے اندر بکری کی طرح 'میں! میں!' کرتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے رضوان صاحب اس 'پلِ صراط' سے بچ کر نکل گئے۔ وہ اپنی ذات کو صرف موضوع کی حدود کے اندر سامنے لائے ہیں۔

کافی عبرت آموز تجربات کے بعد رضوان اللہ کو امریکن سنٹر دہلی، میں 'اردو ایڈیٹر' کی جگہ ملی۔ اس وقت تک صحافت میں ان کے بال و پر جل چکے تھے۔ صحافت سے جو دل لگا لیتا ہے وہ اس عشق سے آزاد نہیں ہوتا۔ اسی دل گرفتگی کی روئداد ہے 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' انھوں

نے یہ وضاحت کردی ہے۔ ''جن حالات اور واقعات کا میں تذکرہ کررہا ہوں، انھیں میں نے جس طرح دیکھا، برتا اور سمجھا اسی طرح بے لاگ بیان کررہا ہوں۔''

کہتے ہیں دیدۂ بینا قطرے میں دجلہ دیکھ لیتی ہے۔ رضوان صاحب نے بھی اپنی ذات کو اسٹیج یا اسکرین بنا کر نہ صرف کلکتہ کی صحافت کو، بلکہ اردو صحافت کو آئینہ دکھایا ہے۔ یہ جائزہ اس معنی میں جامع ہے۔ اس میں کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ صرف صحافت کے پیشہ ورانہ مسائل تک نظر محدود نہیں رکھی گئی ہے۔ اس کے انتظامی، کاروباری، تکنیکی اور مالکانہ پہلو کو بھی دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو صحافت کے سلسلے میں یہ ساری باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

صحافت میں داخل ہونے کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے ''میں ۱۹۵۱ء میں سائیکالوجی (نفسیات) میں ایم ایس سی کرنے کی غرض سے کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں داخلے کا فارم جمع کرنے آیا تھا۔ میں نئے ہندوستان کی سیاست سے نابلد، یہ سمجھنے کو تیار نہ تھا کہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے یا بنگال میں غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے، اس شہر میں ناپسندیدہ ہوسکتا ہوں۔ نتیجے کا انتظار کرتا رہا جو میرے علاوہ ہر سمجھدار پر عیاں تھا لیکن کسی مایوسی میں مبتلا ہونے کے بجائے اس فکر میں مبتلا ہوگیا کہ اگلے برس پھر کوشش کرنے تک ایک سال کا کیا مصرف لیا جائے؟ یہی وہ فکر تھی جو مجھے 'عصرِ جدید' تک لے گئی۔''

یہ اتفاق ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ نہ وہ اردو صحافت کو زندگی سے الگ کرسکے، نہ کلکتہ کو۔ کلکتہ سے تعلق کے بارے میں ان کی مثنوی 'اوراقِ مصور' (۲۰۰۲ء) اس کا ثبوت ہے۔ میرؔ نے دہلی کے گلی کوچوں میں اوراقِ مصور دیکھے تھے، وہی بات رضوان اللہ نے کلکتہ کے بارے میں دیکھی اور محسوس کی ہے۔ اس سے پہلے ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'بے ادبیات' (۲۰۰۰ء) منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس وقت یہ اندازہ ہوا کہ صحافت کے غلاف میں ادیب چھپا ہوا ہے۔

کتاب کا موضوع طے ہوجانے کے بعد انھوں نے اس کے حدود اربعہ اور عہد کے

تعین میں تاخیر نہیں کی۔ یہ بات انھوں نے اختصار کے ساتھ واضح کردی ہے۔''اس پوری داستان کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔یعنی پہلا پتھر کا دور جب لیتھو مشینیں اردو اخباروں کو زندگی کی بھیک دے رہی تھیں اور دوسرا نئی جست کا دور جب آفسٹ مشینوں نے تیز گام ہونے کے لیے حدی خوانی کی، اسی راہ کا اگلا پڑاؤ وہ ہے جہاں کمپیوٹر کمپوزنگ روایتی خوش نویسی سے ہم آغوش ہوئی۔اسی طرح اس کہانی کی ایک اور تقسیم ممکن ہے یعنی نصف اول کو کلکتہ میں 'آزاد ہند' اور 'عصرِ جدید' کی قیادت کا دور کہا جاسکتا ہے تو نصف ثانی کو 'اخبارِ مشرق' کی پیش رفت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔.....اس کہانی کو اس میں شریک ایک کردار کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔اس اعتبار سے بھی کہانی کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔'ایک حصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک دوسرا، ۱۹۷۵ء سے جاری ہے۔۲۴-۲۵ برسوں پر محیط پہلے مرحلے کے دوران میں بذاتِ خود کلکتہ کی صحافت کی بساط پر موجود فعال اور سرگرم تھا۔اردو صحافت سے وابستگی کا دوسرا دور اس اعتبار سے عجیب وغریب ہے کہ میں امریکن سینٹر میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے کلکتہ کے اخباروں اور صحافیوں سے مستقل رابطہ میں تھا لیکن جائے وقوع پر عدم موجودگی کی وجہ سے اس رابطہ میں پہلی سے گہرائی نہ تھی۔'' پورے ملک کی اردو صحافت میں ایک بات مشترک ہے۔اتفاق سے امیدوار جس اخبار میں قدم رکھتا ہے، وہاں جس جگہ بیٹھ جاتا ہے، وہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔اردو کے صحافی کا خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا اخبار نکالے یا اخبار کا مالک بن جائے۔وہ ضرور کوئی الہامی طاقت تھی، جس نے رضوان اللہ کو ایسی مہم جوئی سے محفوظ رکھا۔

کلکتہ کی اردو صحافت کو ملک کی سب سے زیادہ مظلوم صحافت کہہ سکتے ہیں۔رضوان اللہ کے الفاظ میں'' کلکتہ کی اردو صحافت کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں ہی کہا جاسکتا ہے۔وہ یوں کہ اخبارات نکلتے ہیں اور اپنی توانائی اور بساط بھر چل کر دم توڑ دیتے ہیں۔'' آزادی کے بعد اسے کانگریسی حکومت نے نشانہ بنایا۔اسے ملک کے بٹوارے کی صلیب اٹھانی پڑے۔ بنگال میں مسلم لیگ کا زور تھا۔'عصرِ جدید' ان کا ترجمان تھا۔اتنی سی بات کلکتہ کے اردو صحافی کے

'مشکوک' ہونے کے لیے کافی تھی۔ بنگلہ دیش کی تحریک ایک بار پھر کلکتہ کی اردو صحافت کے لیے تازیانہ بن گئی۔ ڈھاکہ کے اردو اخبار بند ہونے کے بعد لوگ کلکتہ کے اردو اخباروں کی طرف دیکھنے لگے۔ رضوان اللہ کا ذاتی ربط 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' سے زیادہ رہا لیکن انھوں نے اپنے معاصر اخباروں اور صحافیوں کا ذکر ہمدردی اور غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے۔ جہاں انھیں تختۂ ستم بننا پڑا اس کے بیان میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کو خاکہ نگاری کا بھی سلیقہ ہے۔ یہ بات کتاب پڑھنے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے۔ اپنے ناخوشگوار تجربات کے باوجود وہ اردو زبان اور صحافت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ یہ بات انھوں نے واضح کر دی ہے۔

''ہمیں اس بات میں کوئی عار نہیں کہ ہم نے صحافت کے اندھے کنویں میں جست لگا دی تھی۔ حالات کار بڑے دشوار اور صبر آزما تھے۔ لکھنے لکھانے میں معاونت کے اسباب و وسائل بہت ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے اور مستقبل میں امید افزا امکانات بھی نہیں نظر آرہے تھے۔ اردو صحافت تو درکنار اردو زبان کا کوئی مستقبل نہیں نظر آرہا تھا لیکن اب حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اردو زبان اور اردو صحافت کا بھی روشن مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ تاہم چند باتیں صحافیوں کے لیے بہت ضروری ہیں، پہلے اردو صحافی ہر فن مولا ہوا کرتا تھا لیکن اب خصوصی مہارتوں کا زمانہ ہے، اس لیے ہر صحافی کے لیے لازم ہے کہ اپنے ذوق اور رجحانِ طبع کے مطابق کسی خاص شعبہ یا گوشے کا انتخاب کرے، مثلاً اقتصادی امور جس پر ہمارے اردو اخباروں میں لکھنے والوں کا قحط ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے آفاق روز بروز پھیلتے جائیں گے، سیاسیات، قومی، بین الاقوامی، مزید براں اس کے علمی و نظریاتی اور تاریخی پہلوؤں سے بخوبی آگاہی اور غائر مطالعہ، اس کے بغیر اپنے پڑھنے والوں کو نہ تو آگاہی دی جاسکتی ہے اور نہ ہی مستقبل میں ان کی رہنمائی کی جاسکتی ہے، جو کہ صحافی کی اولین ذمہ داری ہے۔''

مغربی بنگال اردو اکادمی نے شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تصنیف 'بنگال میں اردو صحافت' کو رئیس احمد جعفری سے نظر ثانی کرانے کے بعد شائع کیا ہے۔ افسوس یہ کہ ابراہیم ہوشؔ کی خود نوشت روزانہ 'اقراء' میں قسط وار ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ رئیس الدین فریدی مرحوم ایڈیٹر

'روزانہ ہند کی خودنوشت' ۹۶-۱۹۹۵ء میں قسط وار شائع ہوئی۔ ان دونوں میں سے کسی کو کتابی صورت میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کہ فائلوں کو دیمک چاٹ لے، ان کا کتابی شکل میں آنا مناسب ہوگا۔ یہ کام فروغ اردو کونسل یا مغربی بنگال اردو اکادمی کو انجام دینا چاہیے۔

بہرحال رضوان اللہ کی کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' آزادی کے بعد بنگال میں اردو صحافت کے بارے میں ایک فریادی دستاویز ہے جو اردو کے مستقبل کے بارے میں سنجیدہ افراد کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرے گی۔

راشٹریہ سہارا، دہلی ۲۸/جولائی، ۲۰۰۶ء
اعتماد، حیدرآباد، ۳۰/جولائی ۲۰۰۶ء
اخبارِ مشرق، دہلی، ۶/اگست ۲۰۰۶ء

کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخی مگر حزنیہ داستان

سہیل انجم

رضوان اللہ صاحب کی تازہ اور زیرِ تذکرہ تصنیف کلکتہ کی اردو صحافت کے تعلق سے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی مدد سے نہ صرف کلکتہ کی اردو صحافت کے نشیب وفراز سے اردو قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ اپنی صحافتی زندگی کی ناہمواریوں سے بھی انھیں روبرو کرایا ہے اور شاید انہوں نے ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے اردو صحافیوں کو ایک سبق بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کتاب کی ابتداء ناخدائے سخن میر تقی میرؔ کے عبرت انگیز شعر کو استعمال کرتے ہوئے کی ہے۔ میں سب سے پہلے اس اقتباس کو جو کہ کتاب کا پہلا اقتباس ہے اور جس میں اس شعر کا استعمال کیا گیا ہے، پیش کرنا چاہوں گا۔ ''یہ ۱۹۵۱ کی بات ہے۔ کلکتہ کی برسات کا شباب اتار پر تھا لیکن آدمی کا وجود بلا رکشہ کھینچے بھی کھڑے کھڑے برف کی طرح پگھلا جاتا تھا کہ میرا پاؤں کلکتہ کی اردو صحافت کے مردہ جسم پر اسی طرح اتفاقاً آ گیا جیسے میرؔ کا پاؤں ''ایک کاسۂ سر'' پر آ گیا تھا اور یہ بھی ہوا کہ آزادیِ وطن کے جلو میں کشت وخون کی وجہ سے ''یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا'' اور وہ بھی مجھ سے کہنے لگا کہ ''دیکھ کے چل راہ بے خبر۔ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پرغرور تھا۔''

دراصل یہ صرف اقتباس نہیں بلکہ پوری کتاب کا یا یوں کہیں کہ کلکتہ کی اردو صحافت کا نچوڑ ہے۔ پوری کتاب میں ان چند سطور کی تشریح پیش کی گئی ہوتی تب بھی یہ چھوٹا سا اقتباس کلکتہ کی اردو صحافت پر ایک بھرپور تبصرہ تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس اقتباس میں جو درد و

کرب اور سوز و گداز ہے وہ پوری کتاب میں بھی موجود ہے۔ البتہ انہوں نے یہ سوچ کر کہ قارئین بور نہ ہو جائیں، اپنی ظرافت طبع کا استعمال کیا ہے اور جگہ جگہ اپنے جملوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑی ہیں۔

کلکتہ شہر یا وہاں کی صحافت اور وہاں کی تہذیب وثقافت رضوان اللہ کی شخصیت اور مزاج میں رچ بس گئی ہیں۔ اس شہر سے ان کا چونکہ ۲۴ برسوں تک تعلق رہا ہے اس لیے دہلی آ کر بھی وہ اس کو فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ''اوراقِ مصور'' کے عنوان سے مثنوی لکھ کر کلکتہ سے اپنے قلمی وقلبی لگاؤ کا ثبوت دیتے ہیں تو کبھی کلکتہ کی اردو صحافت پر کتاب تصنیف کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے اس آخری پڑاؤ میں بھی کلکتہ شہر، جس پر غالب فریفتہ ہو گئے تھے، ان کے ذہن ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ۱۹۹۱ میں آخری بار کلکتہ کو دیکھا تھا لیکن ان کی کتاب کے اوراقِ پریشاں بتاتے ہیں کہ انہیں اب بھی اس شہر نگاراں سے وہی انسیت ومحبت ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ''کلکتہ سے میرا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ قلمی سے زیادہ قلبی تھا اور وہ ناقابلِ شکست تھا۔'' ۱۹۵۱ سے ۱۹۷۵ تک کا ایک طویل عرصہ انہوں نے کلکتہ میں گزارا اور بیشتر اخبارات کو اپنا خون جگر پلایا۔ ان چوبیس برسوں میں کلکتہ نے ان کو کچھ دیا نہیں بلکہ ان سے ان کا عنفوان شباب لے لیا' ان کی صحت وتندرستی لے لی اور ان کی توانائی کو اردو اخبارات کے لیے آکسیجن بنا کر رکھ دیا۔ پھر بھی وہ کلکتہ اور وہاں کی صحافت سے بدظن نہیں ہوئے۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کا عشق یکطرفہ تھا۔ کتاب کے سطور اور بین السطور سے اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کلکتہ کو خیر باد کہنے کے بعد رضوان اللہ صاحب نے دہلی میں امریکی انفارمیشن سنٹر میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے ایک ماہ قبل ان کی ڈائرکٹر نے ان سے کہا تھا کہ وہ کلکتہ جا کر اپنے دوستوں کو الوداع کہہ آئیں۔ لیکن تمام تر آسائشوں کے باوجود وہ نہیں جا سکے۔ دل کی بیماری نے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس واقعہ کا ذکر انہوں نے انتہائی پرسوز انداز میں کیا ہے لیکن اس پر اپنی ظرافت کا چھڑکاؤ کر کے اس کو شوگر کوٹیڈ کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ''بیماری

اور دواؤں کے مسلسل استعمال کی وجہ سے اتنی کمزوری آ گئی تھی کہ سفر کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ تو دفتر والوں کی انتہائی مہربانیاں تھیں کہ ریٹائرمنٹ تک پہنچنے کے لیے درکار دس ماہ کی مدت گزار لی۔ وہ کوئی عصرِ جدید کا دفتر تو تھا نہیں جہاں اٹھارہ برس کاٹنے کے بعد عین بیماری کی حالت میں مجھ پر دروازے بند کر دیے گئے اور واجبات کے نام پر ایک پیسہ نہیں دیا گیا۔''

ان کا آخری جملہ صرف 'عصرِ جدید' پر ہی نہیں بلکہ کلکتہ کی صحافت اور میں تو کہوں گا کہ پوری اردو صحافت پر ایک بھرپور اور طنز آمیز تبصرہ ہے۔ انھوں نے ہمت جٹائی اور اپنے درد و کرب کو خوبصورت انداز میں بیان کر دیا۔ بہت سے لوگ تو اس کی جرأت بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے واقعات جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں، جو ان کے ۲۴ رسالہ صحافتی سفر میں نشانِ عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔

''کلکتہ کی صحافت اور میں'' صرف کلکتہ کی اردو صحافت کا حزنیہ بیان نہیں بلکہ اس کے حوالے سے مسلم معاشرے کا ایک تجزیاتی مطالعہ بھی ہے۔ تقسیمِ وطن کے جلو میں اس معاشرے کی شکست و ریخت، صحافت کی بے زبانی اور بے سمتی، مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی اور بے اثری، احساسِ شکست اور غیر یقینی مستقبل پر ایک لاگ و بے باک تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صاحبِ کتاب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ عنوانات ملاحظہ ہوں: ۱۹۴۷ء کا انقلاب اور مسلم سیاست، مضمحل صحافت اور سراسیمہ قاری، تذکرہ مسلم اداروں کا، بہار میں خزاں، پریس کمیشن کا قیام، نئے دور کا آغاز، بنگلہ دیش کی تحریک، مسلمانوں کی سراسیمگی، جنگ کی اثرات، ایمرجنسی اور سنسرشپ، بنگلہ دیش میں انقلاب، اردو نیوز سروس، پبلسٹی اور پروپیگنڈہ، خبر اور افواہ اور ڈس انفارمیشن وغیرہ۔

اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان میں ضمنی عنوانات باندھ کر کلکتہ کی اردو صحافت کے گیسوئے خمدار کی گرہیں گنوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'عصرِ جدید'، 'الحق'، 'روزانہ ہند'، 'امروز'، 'انگارہ'، 'اخوت'، 'ایثار'، 'کندن'، 'نباض'، 'ایشیا'، 'فانوس ڈائجسٹ'، اخبارِ مشرق'،

'سیاست'، 'آزاد ہند'، 'آبشار'، 'غازی'، 'عکاس'، 'ہلال'، 'کسان مزدور'، 'ہوڑہ ٹائمز'، 'بخشیات'، 'مشرقی ہند'، 'آرزو ہند'، 'اسپورٹس ٹوڈے'، 'اسپورٹس انڈیا'، 'محرک' اور 'عاقبت' وغیرہ اخبارات و رسائل میں سے بعض کا تفصیلی ذکر ہے اور بعض کا اجمالی۔ ان اخبارات کی تاریخِ اجراء بھی ساتھ ساتھ دے دی گئی ہے اور وہاں کے کارکنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ اردو صحافت کا آغاز کلکتہ سے ہوا ہے اور اسی لیے انھوں نے کلکتہ کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں کہا ہے۔ اردو اخبارات کے پتھر کے دور پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے اور کمپیوٹرائیج کی صحافت کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ پتھر کے دور میں پیش آنے والی دشواریوں کو بھی گنایا گیا ہے۔ انھوں نے کلکتہ کی اردو صحافت کے سلسلے میں عہدِ نو کے عنوان سے بھی ایک حصہ شامل کیا ہے، جس میں روزنامہ اخبار مشرق پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''۱۹۸۰ء کے آس پاس اخبارِ مشرق کی اشاعت سے کلکتہ میں آفسیٹ مشین پر اردو اخباروں کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ کمپیوٹر کے ذریعہ کمپوزنگ کے رواج کو ابھی مزید بیس برس باقی تھے۔ اس آغاز کا سہرا بھی اخبارِ مشرق کے سر ہے، جس کا دہلی ایڈیشن بھی جاری ہے۔ اس اعتبار سے کلکتہ کے اخباروں میں اخبارِ مشرق کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔'' اس ضمن میں انھوں نے اخبارِ مشرق کے مدیر وسیم الحق کی ادارتی و صحافتی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ بقول ان کے کلکتہ کے اردو اخبارات کی پالیسی حکمراں پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانے کی رہی ہے۔ لیکن وسیم الحق نے بندھے ٹکے دائرے سے کسی قدر گریز کیا اور اپنی آزادانہ اور غیر جانبدرانہ پالیسی کا اعلان کر دیا۔

آخر میں آخری بات کے عنوان سے انھوں نے موجودہ اردو صحافیوں کو کچھ نصیحتیں کی ہیں، کچھ مشورے دیے ہیں اور کچھ پیغام بھی دیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو سامنے رکھ کر آج کے صحافی موجودہ مقابلے کے دور میں خود کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اردو صحافت کے روشن مستقبل کی بشارت بھی دی ہے اور جب رضوان اللہ جیسا جہاں دیدہ اور صحافت کی بھٹی میں جل کر کندن بن جانے والا صحافی ایسی بشارت دے تو اس پر یقین نہ کرنے

کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ وہ یہ کہ انھوں نے بعض تلخ باتوں کو اپنی بذلہ سنجی سے شوگر کوٹیڈ تو کر دیا ہے لیکن بہت سی باتیں کیپسول کے اندر کی دوا کا ذائقہ رکھتی ہیں۔ چونکہ حق بات تلخ ہوتی ہے اور اسے برداشت کرنے کا مادہ معدودے چند لوگوں میں یا یوں کہیں کہ مزاجاً اور طبعیتاً بڑے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو پڑھ کر جہاں غیر کلکتوی لوگ محظوظ ہوں گے اور تلخ حقائق سے روشناس ہوں گے وہیں مجھے اندیشہ ہے کہ کلکتہ کے کارپرداز صحافت کی پیشانیوں پر ناگواری کے بل پڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کا اندازہ مصنف کو نہ رہا ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے کلکتہ کے کارپردازان صحافت و سیاست کا اصلی چہرہ لوگوں کو دکھانے میں تردد سے کام نہیں لیا ہے۔

بہرحال یہ کتاب کلکتہ کی اردو صحافت سے صرف رضوان اللہ کے تعلق اور رشتے کی گتھیاں ہی نہیں سلجھاتی بلکہ وہاں کی اردو صحافت پر ایک بھرپور تبصرہ بھی کرتی ہے اور سیاست کی اندرون خانہ عیاریوں و مکاریوں سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔ البتہ اس میں بعض مقامات پر جملوں کی تکرار ہے اور پروفنگ کی اغلاط بھی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود اس کتاب کی معنویت کم نہیں ہوتی اور اگر موجودہ دور کے صحافی اس کا مطالعہ کریں تو ان کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ یہ صرف اردو صحافیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی معلومات افزا کتاب ہے۔

قومی آواز، دہلی، ۲۶/نومبر ۲۰۰۶ء

کلکتہ کی اردو صحافت

اشہر ہاشمی

''صحافت نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہو لیکن ایک فخر کا احساس ضرور دیا ہے۔'' [P135]

''عصرِ جدید میں ملازمت کے دوران میری شدید علالت پر کسی طرح کی ہمدردی یا اعانت تو دور کی بات ہے مجھ دھکا دینے کا وہی موزوں ترین موقع سمجھا گیا۔''[P140]

''1964 کے فسادات کے دوران عصرِ جدید والوں نے مجھے کرفیو پاس تک دینا مناسب نہیں سمجھا۔''[P140]

''150 روپئے تنخواہ متعین ہوئی اور چار کالم ترجمہ میرے ذمہ دیا گیا۔''[P131]

رضوان اللہ کی 216 صفحات پر مشتمل تازہ ترین تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں اس طرح کے جملے کثرت سے موجود ہیں جن میں ''کلکتہ''، ''صحافت'' اور ''میں'' تینوں کی جلوہ سامانی یکجا نمایاں نظر آتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع شدہ اس کتاب میں رضوان اللہ نے کلکتہ کی صحافت، اردو اخبارات میں صحافیوں اور غیر صحافی کارکنوں [کاتب، پروف ریڈر، منیجر] کی زندگی، قیام کلکتہ کے 25 برسوں کے دوران خود اپنی علمی، ادبی، تعلیمی، مجلسی، تخلیقی سرگرمیوں اور پیشہ ورانہ جدوجہد کی ایسی داستان بیان کی ہے جس سے بصیرت تو حاصل ہوتی ہے، مسرت نہیں، کیوں کہ اس کتاب کا داخلی مزاج بہت کشیدہ ہے۔ ایسے واقعات بہت کم ہیں جن کو پڑھ کر فرحت کا احساس پیدا ہو۔

رضوان اللہ کی زبان کلکتہ کے بہت سارے نثر نگاروں کے مقابلے میں عمدہ، عیب

سے پاک اور کہیں کہیں مزاح کا پہلو [جیسے قیصر شمیم اپنی مجلس صدارت کے ساتھ دہلی آئے] پیدا کرنے کی کوشش کے سبب دلچسپ ہے۔

رضوان اللہ نے ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں کرداروں اور تاریخوں کی صحت کے ساتھ ان 25 برسوں کی بہت سی وارداتوں کو دستاویز بند کیا ہے اس کے علاوہ 'خبر اور افواہ' 'اردو نیوز سروس'، '1975 میں اخبارات کی فہرست'، 'غلط بیانی سے انکار کی پاداش'، 'اداریئے'، 'رپورٹنگ'، 'مضمحل صحافت'، 'جرنلزم کورس'، 'پریس کمیشن کا قیام'، 'خلافت کمیٹی' جیسے عنوانات قائم کر کے بہت تفصیل سے قاری کے سامنے بہت کچھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور 1951 سے 1975 تک کی وارداتوں کو موضوع سخن بنایا ہے جس میں ان کا ''میں'' بھی ہے اور ''کلکتہ کی اردو صحافت'' بھی اور جتنا کچھ ضبطِ تحریر میں آیا وہ اس کا اعتراف کرانے کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے کلکتہ سے وابستہ اپنی تلخ، ناگوار اور تکلیف دہ یادوں کو نہ صرف 2006 میں ختم ہونے والے 31 برسوں تک اپنے حافظے کا اہم جز بنائے رکھا بلکہ ان کے بیان میں اظہار کی اس شدت کو بھی راہ پانے کا موقع دیا جس کی وجہ سے بعض واقعات کی قرأت کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے رونما ہوتا ہوا سا ہے۔ انہوں نے کچھ واقعات ایسے بھی بیان کئے ہیں جن کو پڑھتے وقت لگتا ہے ہم اس رونما ہوتے ہوئے واقعے کے درمیان سے کردار بن کر گزر رہے ہیں۔ [یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ جس 'عصرِ جدید' اخبار میں رضوان اللہ نے 18 سال گزارے ہیں وہاں مارچ 1973 میں پہنچ چکا تھا]۔

رضوان اللہ نے کلکتہ اور اردو صحافت کا 1975 تک کا بیان کیا ہے۔ 1975 کے بعد سے اب تک بہت کچھ بدلا ہے۔ میں ان زینوں، کرسیوں اور آوازوں کو پہچانتا ہوں جن کا ذکر رضوان اللہ کی اس کتاب میں جا بجا ہے لیکن یہ ایک سچ ہے کہ اب وہ زینے بدل چکے ہیں۔ میز، کرسیاں بھی بدلی ہیں اور آوازیں بھی بدلی ہیں۔ نہیں بدلا ہے تو کلکتہ کے اردو صحافیوں کا مقدر، جن کا رونا رضوان اللہ کی اس کتاب میں رویا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلکتہ کے اخبارات کا ذکر ان کے لیے اپنا لہو بہ رضا و

رغبت جلانے والا کوئی شخص جب کرتا ہے تو اس کا لہجہ اتنا تلخ کیوں ہو جاتا ہے، جتنا کہ رضوان اللہ کا ہے؟ کیا کلکتہ کے اردو اخبارت سے وابستہ صحافیوں کی امنگیں ضرورت سے زیدہ بلند ہیں؟ یا ان اخبارات میں تنخواہوں اور سہولتوں کا نظام اپنے کارکنوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف سے غافل ہے؟

کتاب کمپیوٹر سے کمپوز کرائی گئی ہے، طباعت اور کاغذ ٹھیک ٹھاک ہے، سرورق کتاب کے عنوان سے مطابقت کرتا ہوا سا ہے۔ آخری صفحہ پر رضوان اللہ نے ایک پرانی تصویر شائع کر کے اس گزرے ہوئے وقت سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس کو اس کتاب کے اندر لفظوں میں جیا ہے۔ اور اس کتاب کا انتساب بھی معنی خیز ہے ''ان گمنام صحافیوں کے نام جن کا خون جگر شاہ سرخیوں کے کام آیا'' لیکن یہاں ایک سچ کا اعتراف ضروری ہے کہ رضوان اللہ نے 'عصرِ جدید' کے 18 سال سمیت کلکتہ میں جو 25 سال گزارے وہ سال ان کی ساری حیات پر محیط نہیں ہو سکے۔ وہ آج کارناموں سے پر ایک مطمئن اور آسودہ کیریئر مکمل کر کے سبکدوشی کی آرام دہ زندگی میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ 8 تصنیفات اور تراجم کی فہرست تو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہاں دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلکتہ کے اخبارات میں گزرے ہوئے سختی اور شدت کے 9000 دنوں میں فکر و عمل کی تہذیب و تنظیم غصہ اور ضد کا ثمرہ تو نہیں۔

خبردار جدید، دہلی، یکم تا ۱۵/اگست ۲۰۰۷ء

ماہنامہ آجکل، دہلی، اپریل ۲۰۰۷ء

کلکتہ کی اردو صحافت اور میں

خاور حسن

اردو میں شعر کہنے اور شعری مجموعہ کی اشاعت کا رجحان زیادہ ہے۔ چنانچہ اردو میں کئی ایسے موضوعات ہیں جن پر کتابیں کم ہیں اور لکھنے والے بھی کم ہیں۔ ان موضوعات میں صحافت بھی شامل ہے۔

اردو صحافت پر کتابوں کے کم ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ کئی صحافی بھی اردو سے روزی روٹی صاصل کرنے کے باوجود اس بات کو مانتے ہیں کہ چونکہ اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے اس لیے اردو صحافت کا مستقبل بھی روشن نہیں ہوسکتا لیکن جو لوگ دل و جان سے صحافت سے وابستہ ہیں، باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اردو اگر کہیں مٹ رہی ہے تو کہیں بس بھی رہی ہے۔ آج برطانیہ جیسے ملک کی مقبول زبانوں میں اردو کا شمار ہوتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس سال جن 40 ہزار طلبہ نے برطانیہ میں کمیونٹی لینگویج میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں سب سے زیادہ 6000 کی تعداد اردو طلبہ کی ہے۔ تو یہ سب یوں ہی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں میں، جو باخبر ہیں اور واقعی صحافی ہیں مذکورہ کتاب کے مصنف رضوان اللہ کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے موضوع اور عنوان سے مصنف نے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اپنی بات کو بہتر اور موثر طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے موضوع کے خشک ہونے کے باوجود کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بوریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ پڑھتے ہوئے ایک نشست میں کتاب کو ختم کرنے کی خواہش میں شدت آتی چلی جاتی ہے اور یہ بات صاحب کتاب کے حق میں جاتی ہے۔

پوری کتاب کلکتہ میں اردو صحافت اور مصنف کی ذات پر مرکوز ہے لیکن کتاب اس طرح تحریر کی گئی ہے کہ اپنی بات بھی کہہ دی اور دوسروں کے استفادے کے لیے مواد بھی فراہم کرا دیا۔ ابواب اور پھر ضمنی سرخیوں میں موضوعات کو تقسیم کر کے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ قاری اپنی پسند کے مطابق موضوع کا انتخاب کر کے اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ کتاب میں ایسی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں جو نو وارد صحافیوں کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں اگر وہ پوری توجہ سے مطالعہ کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں صحافت پر کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں ایسی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جو قاری کو ایک سمت دے سکیں اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ یہ کتاب خاص کر اردو کے صحافیوں میں مقبول ہوگی۔

انگریزی میں کتاب کے موضوع کی مناسبت سے قیمت ہوتی ہے کیوں کہ اس کی تیاری میں کتنا وقت اور سرمایہ خرچ ہوا ہے اس کا خیال بھی رکھا جاتا ہے لیکن اردو میں صرف صفحات کی مناسبت سے قیمت دیکھی جاتی ہے لیکن یہ مناسب نہیں اس لیے موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کی قیمت مناسب ہی ہے۔ کتاب کا سرورق بھی چوں کہ اچھا بن پڑا ہے اور چھپائی بھی بری نہیں اس لیے امید ہے، کتاب پسند کی جائے گی۔

عالمی سہارا، ۲۹/جولائی ۲۰۰۶ء

■❖■

مکتوبات Letters

شب خون

313/371, Rani Mandi, P.B. No. 13

Allahabad - 211003

۲۷ر نومبر ۲۰۰۴ء

محترم جناب رضوان چچا صاحب السلام علیکم

آپ کی کتاب کے صفحات لے کر عزیزی بدرِ منیر آئے تھے۔ امید ہے انھوں نے آپ کو مطلع کر دیا ہوگا۔

آپ نے اپنے مسودے کے جو صفحات بھیجے ہیں، وہ میں نے بغور دیکھ لیے۔ کہیں کہیں ایک آدھ بہت ضروری تصحیح کر دی ہے اور کوئی تبدیلی نہیں کی۔ فی الحال صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ کتاب بہت کارآمد معلوم ہوتی ہے اور دلچسپ بھی بہت ہے لیکن ایک بات جو فوری مطالعے کے بعد ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ اسے کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ کا نام دینا شاید درست نہ ہو۔ اس کا رنگ تو ذاتی یادداشتوں یا خودنوشت کا ہے، کیونکہ آپ خود ہی عرصہ ۵۰-۵۵ر سال سے کلکتہ کی صحافت سے وابستہ ہیں، لہٰذا اس کا عنوان کچھ یوں ہونا چاہیے کہ ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' تاکہ آپ کے ذاتی تجربات پر مبنی ہونے کی وضاحت ہو جائے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ صورت میں مسودے میں علامات وقف یعنی Punctuations کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بعض جگہ عبارت بے ربط ہے اور بعض جگہ بے تکلفی کا

رنگ کچھ گہرا ہوگیا ہے۔لیکن ان سب باتوں کو آپ خود ہی مسودہ مکمل کرتے وقت درست کرلیں گے۔

کتاب کی فہرست مضامین ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

آپ کا خادم
شمس الرحمٰن

☆☆

ڈاکٹر ایم شافع قدوائی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی

۲۲/نومبر ۲۰۰۶ء

محترم رضوان اللہ صاحب سلام مسنون!

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔آپ کا گرانقدر علمی تحفہ ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' موصول ہوا۔ یادآوری کے لیے تہِ دل سے ممنون ہوں۔آپ کی تحریروں سے نہ صرف خوب واقف ہوں بلکہ آپ کے مضامین سے بھی برابر استفادہ کرتا رہتا ہوں۔آپ کی کتاب مسودہ کی شکل میں پہلے نظر سے گزر چکی تھی۔آپ نے بڑی معروضیت اور علمی وقار کے ساتھ مشرقی ہندوستان علی الخصوص کلکتہ کی اردو صحافت کے خدوخال واضح کیے ہیں۔معاصر اخبارات کے حسن وقبح اور ان کی ادارتی پالیسی کا بے لاگ جائزہ لیا جس پر جذباتیت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔آپ کی تصنیف کا امتیازی وصف ہے۔اس نوع کی کتابیں اردو میں شاذ ہی ہیں۔

اردو صحافت کی مبسوط تاریخ اب تک سپردِ قلم نہیں کی جاسکی ہے۔امداد صابری کی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخ اردو صحافت تحقیق کے بنیادی اصولوں سے عدمِ واقفیت اور تاریخ کو اپنی ذاتی پسند، ناپسند کے حوالے سے بیان کرنے اور پھر اسنادی شہادتوں سے مکمل اغماض سے عبارت ہے۔آپ نے کلکتہ کے معاصر اردو روزناموں کے گہرے تجزیاتی مطالعے سے اس خلا

کو پر کرنے کی لائق تحسین کوشش کی ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر آپ کی محنت شاقہ کی داد نہ دی جائے۔ آپ نے 'آزاد ہند'، 'عصرِ جدید' اور 'اخبارِ مشرق' سے متعلق اپنے Anecdotes کو بڑے دلچسپ اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے، جو زبان پر آپ کی مکمل دسترس پر دال ہے۔ کتاب کا عنوان ہر چند کہ شمس الرحمان فاروقی صاحب کا تجویز کردہ ہے، آپ کے بقول ''کچھ عجیب سا'' ہے۔ مجھے یہ ٹائٹل خاصا Pretentious لگا گو کہ آپ کی تحریر پر Self-Exaltation کے سائے لرزاں نہیں ہیں۔

کتاب کی دوسری جلد میں نے یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری مولانا آزاد لائبریری کو دے دی ہے، تاکہ اساتذہ اور طلبا اس سے استفادہ کر سکیں۔

باقی حالات بدستور ہیں۔ یادآوری کے لیے ایک بار پھر شکریہ

بخدمت
جناب رضوان اللہ صاحب
D-178, Abul Fazl Enclave
New Delhi - 110025

فقط
نیازمند
شافع قدوائی

☆☆

علقمہ شبلی
کولکاتا-۷۰۰۰۱۶
۳۰/اکتوبر ۲۰۰۶ء

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

برادرِ مکرم رضوان اللہ صاحب! ماہ صیام اور عید سعید مبارک
آپ کی دونوں کتابیں مل گئی تھیں۔ فون پر اطلاع بھی دے دی تھی۔ ''اوراقِ مصور''

میں کلکتہ کے مختلف روپ طرح طرح سے جلوہ دکھاتے ہیں اور اس شہر کو زندگیِ نو عطا کرتے ہیں۔

''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' آپ کی اہم تصنیف ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا۔ کتاب جب تک ختم نہیں ہوئی ہاتھ سے نہیں چھوٹی اور جب ختم ہوگئی تو ہل من مزید ور دِزبان رہا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ یہ کتاب، جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے، کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ بھی ہے اور آپ کی خودنوشت بھی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک آپ کا تعلق یہاں کی اردو صحافت سے براہِ راست رہا اور ایک سرگرم صحافی کی طرح آپ اس کے نشیب و فراز کے چشم دید گواہ رہے اور اسی لیے اس کی تفصیلات میں حقیقت کی جھلکیاں بھی ہیں، دلچسپی کے عناصر بھی اور عبرت کے واقعات بھی۔

اردو صحافت میں مالک و ملازم کی آپسی کشاکش کے حوالے سے جو واقعات آپ نے بیان کیے ہیں، وہ تلخ اور عبرت ناک حقیقت ہیں۔ انتظامیہ کی تنگ دلی، صحافیوں کے استحصال اور ابتر معاشی حالت کے باوجود ہم پیشہ صحافیوں کے متعلق آپ کا وثوق سے یہ کہنا کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی'' بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

کلکتے کی اردو صحافت کی اس سرگزشت میں ملکی سیاست خاص طور سے مسلم سیاست کے تعلق سے آپ کے خیالات متوازن اور فکر انگیز ہیں۔ ان سے اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن معروضیت کی داد نہ دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ مسلم اداروں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مسلم درس گاہوں پر آپ کی طائرانہ رائے زنی بھی آپ کی مثبت سوچ کی غماز ہے۔ اس میں کلکتہ کے بیشتر صحافیوں کا ذکر ہے جن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو ریگ زارِ وقت میں گم ہوگئے ہیں اور جن کی یاد آپ نے تازہ کردی ہے۔ ادریس الحق، بسنت کمار چٹرجی، حامد محمود نیازی، سید محمد مصطفیٰ صابری اور اسرائیل احمد وغیرہ کچھ ایسے ہی صحافی ہیں۔

اردو روزناموں کے درمیان صحافتی چشمکوں اور ذاتی رقابتوں پر بھی آپ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ 'عصرِ جدید'، 'روزانہ ہند' اور 'آزاد ہند' کے فکاہیہ کالم قلم کی جولانیوں اور زبان کی بے لگامیوں کے خاموش گواہ ہیں۔ قارئین کو ان کا انتظار رہتا تھا اور یہ کالم دلچسپی سے پڑھ جاتے

تھے۔لیکن اس سے انکار نہیں کہ صحت مند صحافت اس سے متاثر ہوئی۔

کلکتے کے ذکر نے صرف غالبؔ ہی کے سینے میں تیر نہیں مارا تھا بلکہ جو بھی یہاں آیا وہ اس تیر نیم کش کی خلش محسوس کیے بغیر نہ رہا۔آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کلکتے سے مراجعت کے بعد آپ نے دہلی میں ایک نیا کیریئر شروع کیا جہاں نسبتاً تنخواہ بھی معقول تھی اور دوسری رعایتیں بھی حاصل تھیں اس کے باوجود ''کلکتے سے جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ نا قابلِ شکست تھا۔'' کلکتہ طرح طرح سے آپ کے دامن تھامے رہا اور اس کی جلوہ گری کبھی ''اوراقِ مصور'' کی صورت میں اور کبھی ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کے ذریعہ ہوتی رہی۔

زبان و بیان پر جو آپ کو قدرت ہے، اس کی جھلکیاں کتاب میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔یقیناً کتاب اس قابل ہے کہ اس کی پذیرائی کی جائے۔اگر آپ اس طرف توجہ نہ کرتے تو خود پر ظلم کرتے یا نہ کرتے، ہم قارئین پر ضرور ظلم ہوتا اور اردو صحافت کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہ جاتے۔اس سے فرضِ کفایہ کی ادائیگی تو ہو ہی گئی ساتھ ہی ساتھ بعد میں آنے والے اس چراغ سے چراغ روشن کرتے رہیں گے اور آپ کی ہدایات پر عمل کر کے اس راہ دشوار کو بہ آسانی طے کریں گے۔آخر میں آپ ہی کا شعر ذرا ترمیم کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

تمام عمر نشستید و شب سحر کردید
کہ سنگ ریزہ ہارا رشکِ صد گہر کردید

اب میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔معالجین کی ہدایت ہے کہ زیادہ نقل و حرکت نہ ہو اور دماغی و ذہنی کاموں میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے۔اس لیے گھر میں مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔پھر بھی خدا کا شکر ہے، دعائے خیر فرمایئے۔

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔کبھی کبھی یاد کر لیا کیجیے۔

بندۂ خلوص
علقمہ شبلی

محترم جناب رضوان اللہ صاحب السلام علیکم

اللہ آپ کے تعمیری، انقلابی اور بے لاگ قلم کو ہمیشہ ثابت قدم رکھے (آمین)۔ بڑے بھائی عارف ضیاء کا ارسال کردہ شاہکار ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' ہاتھ میں ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ سورج کو چراغ کیونکر دکھاؤں۔ آپ نے کلکتہ ہی نہیں بلکہ سارے ملک میں اردو پریس کی بوسیدہ اور شکستہ حالت کی چاہے وہ دورِ حاضر ہو یا ماضی قریب میں شاندار عکاسی کی ہے۔ قیام کلکتہ میں مصنف کے گزرے ۱۸ر سال پوری صدی پر محیط ہیں۔ افسوس کہ اس شکل میں آج بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میرے اپنے آبائی وطن قنوج، جہاں پر روزنامہ سیاست جدید اور قومی آواز وغیرہ پابندی سے دیکھتے ہوئے بڑا ہوا ہوں جن کی شکستہ حالت میرے لاشعور میں کہیں محفوظ تھی، آپ نے الفاظ دیے ہیں۔ موجودہ وقت میں جب میں مرادآباد میں Biology کا لکچرر اور ہوسٹل وارڈن بھی ہوں، روزنامہ صحافت اکثر نظر سے گزرتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں دورانِ طالب علمی جب میں مختلف میگزین کا ایڈیٹر رہا وہ ایک شوقیہ دور تھا، لیکن میرے اندر سوئے ہوئے صحافت کے جراثیم آپ کی سرگزشت پڑھ کر نیم بیدار ہوگئے ہیں۔ ہمارے پورے خاندان نے ہمیشہ ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کیا ہے۔ اس حوالے سے کلکتہ میں گزارے آپ کے ایام اور ایم.اے. میں داخلہ نہ ہونا دل میں درد پیدا کرتا ہے۔

مثنوی کو مزاح کے رنگ میں پیش کرنا آپ کی بہت بڑی خوبی ہے۔ طنز و مزاح وہی مصنف کرسکتا ہے، جس کے پاس ساری دنیا کی معلومات اور گہری فکر ہو۔ جنگِ آزادی کے دور میں کلکتہ کے حالات اور حکومت کا اردو پریس کے تئیں نقطۂ نظر، ہندوستانی تاریخ میں میل کا پتھر ہے۔ کلکتہ شہر کی شناخت میں آپ نے اپنی شمولیت کمال ہنرمندی سے دکھائی ہے۔ میرا مزاج عملی طور پر انگریزی اور روحانی طور پر اردو کا ہے۔ آپ کی سرگزشت سے میری کافی اصلاح ہوئی ہے۔ کیونکہ شاید آپ کو یہ جان کر تعجب ہو کہ اردو میں نے کبھی اسکول میں نہیں پڑھی ہے۔ ہمیشہ کانونیٹ یا انگریزی میڈیم کا طالبِ علم رہا ہوں، اس لیے املا کی غلطیاں لازمی ہیں۔ امید

ہے درگزر فرمائیں گے۔

چلتے چلتے یہی عرض کروں گا کہ عارف بھائی نے آپ سے متعارف کرا کر میری ذات پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ مستقبل میں آپ بندے کو اپنی کاوشوں سے باخبر رکھنے کی زحمت گوارہ کریں گے۔ میرے والد جناب ابوالحسن صاحب آپ کے شکر گزار ہیں۔ اور ہم سب امید کرتے ہیں کہ آپ سے جلد ہی ملاقات کا شرف حاصل کریں گے۔ میرے اور اہلِ خانہ کی جانب سے آپ کو تسلیمات۔

نیازمند

توقیر ضیاء

ماڈرن پبلک اسکول

دہلی روڈ، مرادآباد

■❖■